اردو کی ادبی تواریخ میں ذکرِ شبلی

ڈاکٹر خالد ندیم

استاد شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف سرگودھا (پاکستان)

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کا نام اردو زبان و ادب کی تاریخ کے رجحان ساز ادیبوں میں شامل ہے۔ اگرچہ وہ اردو کے عظیم انشا پردازوں کے دور میں پیدا ہوئے اور سرسید احمد خاں (پ: ۱۸۱۷ء)، مولانا محمد حسین آزاد (پ: ۱۸۳۰ء)، ڈپٹی نذیر احمد (پ: ۱۸۳۶ء) اور مولانا حالی (پ: ۱۸۳۷ء) جیسے ناموروں کی نسبت صغیر سن بھی تھے، لیکن انھوں نے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے اپنے لیے الگ جگہ بنائی۔ اب جب کہ ان کے مقام و مرتبے کا تعین اور ان کی علمی و ادبی خدمات کی قدر و قیمت کا تعین ہو چکا ہے اور انھیں بجا طور پر اردو ادب کی نابغہ روزگار شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے، اردو ادب کی تاریخوں میں ان کے بارے میں پیش کی جانے والی آرا کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد محض یہ معلوم کرنا ہے کہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر تصانیف اور مضامین سے قطعِ نظر اردو کے ادبی مؤرخین کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ مصنف یا مضمون نگار بالعموم اپنے موضوع سے سروکار رکھتا ہے، جب کہ ادبی مؤرخ کو ساری تاریخ کے درمیان رہ کر سوچنا پڑتا ہے، چنانچہ مصنف و مؤرخ کے ہاں کسی شخصیت اور اس کے کارناموں سے متعلق ایک مختلف رویہ سامنے آتا ہے۔

اردو ادب کی اب تک لکھی گئی تاریخوں میں ‘تاریخِ ادبِ اردو’ (رام بابو سکسینہ)، ‘داستانِ تاریخِ ادب’ (حامد حسن قادری)، ‘تاریخِ ادبیاتِ اردو’ (ڈاکٹر ابو سعید نور الدین)، ‘اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ’ (ڈاکٹر سلیم اختر)، ‘اردو ادب کی تنقیدی تاریخ’ (احتشام حسین)، ‘اردو ادب کی تاریخ’ (ڈاکٹر انور سدید)، ‘اردو ادب کی تاریخ’ (ڈاکٹر تبسم کاشمیری) اور ‘تاریخِ ادبِ اردو’ (ڈاکٹر جمیل جالبی) نمایاں ہیں، جن میں علامہ شبلی نعمانی کا تذکرہ ملتا ہے۔

علامہ شبلی کی وفات کے تیرہ برس بعد ۱۹۲۷ء میں شائع ہونے والی رام بابو سکسینہ کی History of Urdu Literature (‘تاریخِ ادبِ اردو’ مترجمہ مرزا محمد عسکری) ‘حصہ نظم’ اور ‘حصہ نثر’ میں منقسم ہے، البتہ دونوں حصوں کے ابواب کو مسلسل رکھا ہے۔ یوں یہ تاریخ ‘حصہ نظم’ کے چودہ ابواب سمیت کُل انیس ابواب پر مشتمل ہے، جن میں سے سولھویں باب ‘نثر اردو کا دَورِ متوسط اور دَورِ جدید’ میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ بحث ‘تعلیم اور ابتدائی مشاغل’، ‘قیامِ علی گڑھ’، ‘ابتدائی تصانیف’، ‘قیامِ حیدر آباد’، ‘ندوۃ العلما’، ‘دار المصنّفین اعظم گڑھ’، ‘قابلیت اور خدمات کا اعتراف’، ‘اخلاق و عادات’، ‘تصانیف’، ‘مولانا بحیثیت مؤرخ کے’، ‘مولانا بحیثیت ناقد کے’ اور ‘طرزِ تحریر’ کے عنوانات میں تقسیم ہے۔

اگرچہ نو دس صفحات میں کوئی جامع مقالہ نہیں لکھا جا سکتا اور کسی شخصیت اور اس کے فکر و فن کا بالتفصیل تجزیہ ممکن نہیں، لیکن علامہ شبلی سے متعلق سکسینہ کی چند آرا ایسی ہیں، جو آج بھی شبلی شناسی میں اہمیت رکھتی ہیں۔ سکسینہ لکھتے ہیں:

۱۔ شبلی نعمانی اپنے زمانے کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے۔ نہایت کثیر الاشواق اور جامع الاذواق تھے۔ اگر کوئی شخص ایک شاعر، فلسفی، مؤرخ، ناقد، ماہرِ تعلیم، معلم، واعظ، ریفارمر، جریدہ نگار، فقیہ، محدث، سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی کہ انھوں نے ان سب کمالاتِ مختلفہ اور علوم و فنونِ متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا۔ (سکسینہ، ۴۲۶)

۲۔ جس طرح سے مولانا نے نکاتِ تنقید بطرزِ مغرب آرنلڈ صاحب سے حاصل کیے ہوں گے؛ اسی طرح انصافاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی کتاب The Preaching of Islam کی اکثر باتوں کے لیے مولانا کے ممنون ہیں۔ (سکسینہ، ۴۲۸)

۳۔ اگر کسی شخص کو زمانۂ حال کی کوئی ایسی تصنیف دیکھنا ہو، جو وسعت مطالعہ اور تحقیق کے ساتھ فصاحت و بلاغت اور سلاستِ زبان کا ایک بہترین مجموعہ کہی جا سکے تو اس کو ‘شعر العجم’ دیکھنا چاہیے.... یہ سچ ہے کہ مولانا کے انتقال کے بعد اس کی اکثر غلطیاں نکالی گئیں اور وہ ایک جارحانہ نظر سے دیکھی جا رہی ہے، مگر پھر بھی ہمارے نزدیک، کتاب کی قدر و قیمت اور مولانا کے تبحر علمی میں اس سے کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ کتابِ مذکور نظمِ فارسی کی ایک مکمل تاریخ اور نہایت سلیس اور دلچسپ زبان میں ہے۔ (سکسینہ، ۴۳۴-۴۳۵)

سکسینہ کی ان تنقیدی آرا سے اردو تنقید آج بھی مستفیض ہو رہی ہے؛ البتہ ان کے ہاں بعض تحقیقی تسامحات در آئے ہیں، جن کی نشان دہی ضروری خیال کی جاتی ہے۔

۱۔ سکسینہ نے لکھا ہے کہ ‘۱۸۸۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ملنے کے لیے، جو علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے، علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا’، (سکسینہ، ۴۲۸) حالانکہ یہ واقعہ اکتوبر ۱۸۸۱ء کا ہے۔ سکسینہ نے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کا تعلق شبلی کے دوسری مرتبہ علی گڑھ جانے سے ہے، جس کے نتیجے میں وہ جنوری ۱۸۸۳ء کے آخر میں چالیس روپے ماہوار پر علی گڑھ کالج میں اسسٹنٹ عربک پروفیسر مقرر ہوئے۔

۲۔ سکسینہ نے لکھا ہے کہ ’۱۸۸۴ء میں مثنوی ’صبحِ اُمید‘ کا ستارہ مولانا کے افق تصنیف پر جلوہ گر ہوا‘، (ایضاً) حالانکہ یہ مثنوی ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ (الیاس، ۲۹) یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مؤلف ’حیاتِ شبلی‘ نے اس مثنوی کا سالِ اشاعت ۱۸۸۵ء درج کیا ہے۔ (سلیمان، ۳۶)

۳۔ سکسینہ کے خیال میں ’مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم‘ ۱۸۸۶ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں بطور ایڈریس پیش کی گئی تھی، ۱۸۸۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی‘، (سکسینہ، ۴۲۹) حالانکہ یہ مقالہ لکھنؤ میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے اجلاس منعقدہ ۲۷/دسمبر ۱۸۸۷ء میں پڑھا گیا (سلیمان، ۱۵۳) اور اس کی اشاعت ۱۸۸۸ء میں عمل میں آئی۔ (الیاس، ۲۹)

حیرت ہے کہ سکسینہ شبلی کی شاعرانہ خصوصیات کو نظر انداز کر گئے اور تاریخ کے ’حصہ نظم‘ میں ان کا نام تک نہ لیا اور ’مولانا بحیثیت ناقد کے‘ میں انھیں ’شاعرِ شیریں مقال‘ (سکسینہ، ۴۳۴) کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

حامد حسن قادری (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۴ء) کی ’داستانِ تاریخِ اردو‘ کی تالیف کا آغاز ۱۹۳۸ء میں ہوا، ۲۳/ستمبر ۱۹۴۱ء کو اس کا دیباچہ لکھا گیا اور نومبر ۱۹۴۱ء میں یہ کتاب آگرہ سے بابو لکشمی نرائن نے شائع کر دی۔ مصنف کو ’اس تالیف کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں ہے، بلکہ اس کے بعض حصوں کے نامکمل رہ جانے کا اعتراف ہے‘۔ (حامد، ۲۳) جب اس کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی تو مصنف کو ’عافیت اسی میں نظر آئی کہ کتاب جیسی کچھ ہے، دوبارہ چھپوا دی جائے؛ چنانچہ نظر ثانی میں درستی و ترمیم اور حذف و اضافہ کرتا گیا اور پچاس پچاس سو سو صفحے چھپنے کے لیے بھیجتا گیا‘، (حامد، ۳) آخر ۱۹۵۷ء میں یہ کتاب آگرہ ہی سے دوبارہ چھپ گئی۔ کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء اور چوتھا ۱۹۸۸ء میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا۔ واضح رہے کہ چوتھا ایڈیشن تیسرے ایڈیشن کی مکرر اشاعت ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کے خیال میں، اگرچہ ’یہ انیسویں صدی کے اختتام تک ہی کے مصنفوں کا احصا کرتی ہے، لیکن تاحال یہ اردو نثر نگاروں کی بہترین تاریخ ہے‘؛ (گیان، ۹۱۴) چنانچہ ’مستشرقین اور عہد سرسید کے اردو کے عناصرِ خمسہ کا بیان آج بھی قابلِ قدر ہے‘۔ (ایضاً)

’داستانِ تاریخ اردو‘ ابتدائی دو ابواب (آغازِ اردو سے پہلے اردو زبان، آغازِ اردو) کے بعد نثر کے چھ ادوار کا احاطہ کرتی ہے۔ ان چھ نثری ادوار میں سے شبلی نعمانی کا ذکر ’نثر کا چھٹا دَور (غدر کے بعد)‘ میں ہوا ہے۔ کتاب کے صفحہ ۷۱۸ سے صفحہ ۹۰۰ تک ۱۸۳/صفحات بنتے ہیں، گویا یہ کسی باب کا حصہ نہیں، بلکہ ایک مکمل کتاب قرار دی جاسکتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اسے علیحدہ سے کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو یہ احساس بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ کسی کتاب سے مستعار ہے۔

حامد حسن قادری نے شبلی کی پیدائش سے ان کی وفات تک تیرہ صفحات پر نہایت جامع گفتگو کی ہے۔ سید سلیمان ندوی کی ’حیاتِ شبلی‘ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے دو سال بعد شائع ہوئی، لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں۔ اگرچہ بعض ضروری امور نظر انداز ہو گئے، تاہم سوانحِ شبلی سے متعلق تمام بنیادی معلومات فراہم ہوگئی ہیں۔

’علامہ کے اخلاق و عادات‘، ’علامہ شبلی کے مذہبی خیالات‘ اور ’سیاسی خیالات و قومی خدمات‘ میں مصنف نے مولوی حبیب الرحمٰن شروانی، مولوی عبدالحلیم شرر اور خواجہ غلام الثقلین کی تحریروں سے طویل اقتباس دیے ہیں، لیکن تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا، جس سے معلوم ہو کہ خود مصنف کا نقطۂ نظر کیا ہے۔

’علامہ شبلی کی تصانیف‘ میں مصنف نے نوعیت کے اعتبار سے شبلی کی جملہ تصانیف کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ساتھ اُن تصنیفی منصوبوں سے روشناس کرایا ہے، جو بوجوہ رُو بعمل نہ آسکے۔ ان کا درج ذیل بیان ان کی تنقیدی اور تاریخی بصیرت کا ترجمان ہے:

> امام صاحبؒ کی سوانح (سیرۃ النعمان) لکھنے میں علمِ کلام کی بحث اور امام ابوحنیفہؒ کا اس سے تعلق سامنے آگیا..... علامہ شبلی نے تمام ’کلام‘ اور ’کلامیوں‘ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اس دلچسپی میں وہ ’سلسلہ فرماں روایانِ اسلام‘ ہاتھ سے چھوٹ گیا..... اور یہ بہت اچھا ہوا۔ ’ملک شاہ سلجوقی‘ اور ’نورالدین زنگی‘ وغیرہ کو لکھ بھی دیتے تو بجز ’تالیفِ شبلی‘ کے اَور کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی۔ یہ بات اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ علامہ کی تمام تصانیف میں ’المامون‘ سب سے کم پڑھی جاتی ہے۔ (حامد، ۷۴۳)

شبلی کے طرزِ تحریر پر بات کرتے ہوئے وہ ’لطیف و نازک استعارہ و تشبیہ‘، ’حسن تناسب‘، ’لطافتِ خیال‘، ’قوتِ استدلال‘، ’ندرت و جدت‘، ’حسن نظر‘ اور ’ذوقِ سلیم‘ وغیرہ جیسی روایتی تراکیب سے کام لیتے ہیں؛ البتہ ان کا یہ کہنا بہت اہم ہے کہ ’علامہ شبلی اپنے زمانہ کے پہلے شخص [تھے]، جنھوں نے اسلوبِ تحریر کی اہمیت کو سمجھا‘۔ (حامد، ۷۴۴)

انھوں نے سب سے پہلے اوّلیاتِ شبلی کی نشاندہی کی۔ سوانح نگاری میں مولانا محمد حسین آزاد کی ’دربارِ اکبری‘ اور الطاف حسین حالی کی ’حیاتِ سعدی‘ اور تنقید میں آزاد کی ’آبِ حیات‘ و ’سخن دانِ فارس‘ اور حالی کے ’مقدمہ شعر و شاعری‘ کے باوجود ’سیرۃ النبی‘، ’الفاروق‘، ’شعر العجم‘ اور ’موازنۂ انیس و دبیر‘ کو ’سیرت‘ و ’تنقید‘ میں شبلی کی اوّلیات قرار دیتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ’جب شبلی نے ان چیزوں پر قلم اٹھایا تو اس زمین کو آسمان کر دیا‘۔ (حامد، ۷۴۶) اسلام کے عقائد و اعمال اور احکام و شرائع کو عقل کے مطابق اور مصلحتِ زمانہ پر مبنی ثابت کرنے میں سرسید اور ان کی تقلید میں مولوی چراغ علی کی اوّلین کوششوں کے باوصف، وہ سمجھتے ہیں کہ ’اس فن کی تاریخ و اصول اور اہلِ فن کا طریقۂ عمل سب سے پہلے علامہ شبلی نے پیش کیا‘، (حامد، ۷۴۷) چنانچہ ’علم الکلام‘، ’الکلام‘، ’الغزالی‘ اور ’سوانح مولانا روم‘ کو اس فن کی اوّلیات قرار دیتے ہیں اور آخریات بھی۔ (حامد، ۷۴۶) اسی سلسلے میں وہ مثنوی مولانا روم سے علمِ کلام کے مسائل کی ترتیب کو

علامہ کی جودتِ طبع اور فکرِ رسا کا ثبوت قرار دیتے ہیں۔ شبلی کی اوّلیات کی بابت ان کا یہ تجزیہ قابلِ ذکر ہے:

> ’ان تمام تصانیف میں ’بلاغتِ کلام‘ جس حد تک ہے، اس میں کوئی ہم عصر شبلی کو نہیں پہنچتا؛ اس لیے وہ ادیب و نقاد اور مؤرخ و سیرت نگار، ہر حیثیت سے رِفعتِ مرتبت میں بالکل منفرد ہیں۔‘ (حامد، ۷۴۷)

شبلی کی شاعری پر بات کرتے ہوئے، ان کے آخری دَور کے فارسی کلام کو ’کلام بہت منجھا ہوا اور معیار سے قریب‘ قرار دیتے ہیں اور فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ ’اُس زمانے میں ان سے زیادہ پُرگو اَور بھی تھے، زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا‘۔ (حامد، ۷۴۹) دوسری جانب اردو شاعری میں وہ انھیں قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔

شبلی سے متعلق اس تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ علامہ شبلی پر اعتراضات اور ان کا تجزیہ ہے۔ ان کی نوعیت دو طرح کی ہے، اجتہادی اور تحقیقی و تنقیدی۔ اجتہادی نقطۂ نظر سے شبلی پر وارد ہونے والے اعتراضات پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہوسکتا:

> ’سرسید باقاعدہ عالم، محدث، فقیہ نہ تھے اور علامہ شبلی سب کچھ تھے۔ سرسید کی رایوں کو تو ’دخل در معقولات‘ سمجھا گیا تھا، لیکن علامہ شبلی کے ’اجتہادِ نو‘ کی حمایت میں ان کے جبہ و دستار تھے؛ علمائے ملت کی برہمی و برافروختگی کا یہی باعث تھا۔‘ (حامد، ۷۵۳)

تحقیقی و تنقیدی نوعیت سے ’سیرۃ النعمان‘، ’الفاروق‘، ’موازنۂ انیس و دبیر‘ اور ’شعرالعجم‘ پر بعض سوالات اٹھائے گئے ہیں، جن میں سے بعض پر مصنف نے مفصل گفتگو کی ہے اور اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور حافظ محمود شیرانی نے ’شعرالعجم‘ کی تحقیقی غلطیوں پر سخت گرفت کی، البتہ مصنف کا کہنا ہے:

> ’مختلف لوگوں نے مضامین اور رسالے لکھ کر اس کی تاریخی و تنقیدی غلطیاں دِکھائیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی مؤرخ سے زیادہ نقاد تھے۔ ’شعرالعجم‘ کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ فارسی شاعری کی وسعت و جامعیت ثابت کی جائے اور تنقید و موازنہ کر کے شاعروں کے کمالات دِکھائے جائیں۔ اس کام کے لیے فی الجملہ ملکی تاریخ اور شاعری کا ارتقا بھی بیان کرنے کی ضرورت تھی اور شاعروں کے حالات بھی، لیکن ذاتی حالات یا ملکی تاریخ مقصود بالذات نہ تھی۔‘ (ایضاً)

اس تاریخ میں دوسری تمام تواریخ کے مقابلے میں ’شعرالعجم‘ کے حوالے سے پروفیسر براؤن کی ’ادبی تاریخِ ایران‘ پر شبلی کے بیان پر تبصرہ ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ شبلی کی طرف سے براؤن کی تاریخ کو ’عامیانہ اور سوقیانہ‘ قرار دینے پر مصنف نے سخت تنقید کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ شبلی کا بیان درست نہیں ہے۔ مصنف نے شبلی کے مذکورہ تبصرے کے برعکس پروفیسر براؤن کی ’انصاف پسندی اور کشادہ دِلی‘ کی تعریف کی ہے اور ’شعرالعجم‘ کے منظرِ عام پر آنے کے بعد براؤن کی طرف سے اپنی تاریخ کی آئندہ جلد میں ’شعرالعجم‘ سے استفادے اور شبلی کے بعض بیانات کی تحسین کا ذکر کیا ہے۔ (حامد، ۷٦۲-۷٦۳)

اس تاریخ کا ایک اہم وصف ’تصانیفِ شبلی کے نمونے‘ ہے، جس میں ’المامون‘، ’سیرۃ النعمان‘، ’الفاروق‘، ’سفرنامۂ روم و مصر و شام‘، ’الغزالی‘، ’علم الکلام‘، ’الکلام‘، ’سوانح مولانا روم‘، ’موازنۂ انیس و دبیر‘، ’شعرالعجم‘، ’سیرۃ النبی‘، رسائل و مقالات، مقالاتِ شبلی اور مکاتیب و خطوط سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ مصنف نے محض اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ہر کتاب کا تصنیفی پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے اور اس تصنیف کی قدر و قیمت پر بھی بحث کی گئی ہے۔ چند آرا ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ یہ کام [’المامون‘] حقیقت میں نہایت دُشوار ہے، لیکن علامہ شبلی نے اپنے علم و فضل، وسعت مطالعہ سے اور اس سے زیادہ اپنے ذوقِ صحیح اور دقتِ نظر سے ایسی خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ اردو میں اس سے بہتر نمونہ موجود نہ تھا۔ (حامد، ۷٦٦)

۲۔ [’سیرۃ النعمان‘ کی] کی ترتیب و تالیف میں علامہ کی جدت اور مسائل کے فیصلہ و محاکمہ میں ان کا اجتہاد شامل ہے۔ یہی اجتہاد علامہ اور علما کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا تھا۔ (حامد، ۷۷۲)

۳۔ باوجود اعتراضات کے، ’الفاروق‘ ایسی جامع و مکمل کتاب تالیف ہوئی ہے کہ کسی زبان میں اس کا جواب موجود نہ تھا۔ خود علامہ کی ادبیت ’الفاروق‘ میں پہلی سب کتابوں سے بہتر ہے۔ (حامد، ۷۸۱)

۴۔ ان کے ذہنِ رسا اور دقتِ نظر نے کلامِ انیس کا جیسا تجزیہ و تبصرہ کیا ہے؛ جو نکتے نکالے ہیں، جو موازنے کیے ہیں؛ وہ دوسرے [سرے؟] سے مشکل تھے۔ (حامد، ۷۲٦-۷۲۷)

حامد حسن قادری نے شبلی سے متعلق جو رائے قائم کی ہے، اس میں دوسروں کے تعصّبات کا کوئی دخل نہیں اور یہی اس تاریخ کی سب سے بڑی خاصیت قرار دی جا سکتی ہے؛ مثلاً انھوں نے ’خطوطِ شبلی‘ کے ذیل میں منشی محمد امین زبیری اور مولوی عبدالحق کے خیالات کو نقل کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ ’لوگوں کی ستم ظریفی ہے کہ مرے ہوؤں کے گھر کے بھید اور دل کی باتیں سرِ بازار تشہیر کر دیتے ہیں اور ’ستم ظریفی‘ کا لفظ اگر کہیں صادق آ سکتا ہے تو اس کا بہترین محل یہ ’خطوطِ شبلی‘ ہیں‘، (حامد، ۸۸۹) چنانچہ مصنف نے ’محبت و خلوص‘، ’فارسی پڑھانے کا شوق‘، ’موسیقی سکھانے کا شوق‘، ’عورتوں کے اوصاف علامہ کی نظر میں‘ اور ’اپنی تصانیف اور شاعری کے متعلق‘ عنوانات کے تحت ’خطوطِ شبلی‘ سے اقتباسات پیش کیے، لیکن کسی رائے اور تبصرے کے بغیر۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، ’داستانِ تاریخِ اردو‘ کا زیرِ بحث حصہ بجائے خود ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مطالعے سے شبلی سے متعلق تمام تر بنیادی معلومات، ان کے علمی و ادبی کارناموں سے شناسائی، ان کی قدر و قیمت اور اسلوب کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ابو سعید نورالدین کی ’تاریخِ ادبیاتِ اردو‘ مغربی پاکستان اردو

اکیڈمی لاہور کی طرف سے بظاہر ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی، لیکن جیسا کہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اس تالیف کا تعارف ۵/ مارچ ۱۹۶۹ء کو لکھا گیا، اس لیے ضروری ہے کہ کتاب اس سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہو۔ خود مصنف نے ۱۵/ ستمبر ۱۹۸۹ء کو لکھے گئے دیباچہ کتاب میں یہ کہہ کر اس بات کی تصدیق کی ہے کہ 'پیش نظر کتاب ایک تحریک کے ماتحت بہت پہلے لکھی گئی تھی، لیکن اس کی اشاعت میں بڑی تصویق پیش آئی، جو خلافِ توقع تاخیر کا باعث ہوئی'۔ (نورالدین، ۱۲) بہر حال، ۱۹۶۹ء یا اس سے قبل لکھی ہوئی یہ کتاب نظر ثانی کے بعد ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی۔

یہ کتاب دو حصوں، یعنی حصہ اوّل 'اردو نثر' اور حصہ دوم 'اردو نظم' پر مشتمل ہے اور دونوں حصے الگ الگ جلد کی صورت میں شائع ہوئے۔ پہلی جلد پانچ ابواب میں منقسم ہے، جس میں سے علامہ شبلی باب چہارم 'اردو نثر میں اصلاحی اقدام' میں زیرِ بحث آئے ہیں۔

ابوسعید لکھتے ہیں کہ 'تاریخ، تحقیق اور تنقید سب معاملے میں مَیں نے قابلِ اعتماد تحقیقات اور تنقیدی رویوں سے فائدہ اٹھایا ہے؛ البتہ حسب ضرورت جگہ جگہ اپنے خیالات اور رویوں کا اظہار کیا ہے، بالخصوص تبصروں کی شکل میں جو کچھ لکھا ہے، وہ سب ہی اپنے خیالات ہیں'؛ (نورالدین، ۱۳) چنانچہ زیرِ بحث حصے میں بھی مؤلف نے یہی انداز اپناتے ہوئے شبلی نعمانی کے سوانحی کوائف درج کیے ہیں؛ البتہ 'ادبی زندگی' کے ذیل میں تصانیفِ شبلی کے تجزیاتی مطالعے میں انھوں نے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس حصہ باب میں ابوسعید اوّل اوّل کتاب کا تعارف، بعض ناقدین کی رائے اور اپنا تجزیہ پیش کرتے ہیں، ساتھ ساتھ نمونۂ عبارت بھی اقتباس کرتے ہیں۔ 'الفاروق' پر ان کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

> 'مولانا شبلی کی 'الفاروق' لاجواب کتاب ہے۔ اردو میں کیا، کسی زبان میں بھی اس پایے کی کتاب موجود نہ تھی۔ اس کے بعد اردو میں دوسرے علما نے حضرت عمر فاروق پر چھوٹی بڑی کئی سوانح عمریاں لکھی ہیں، لیکن سب مولانا شبلی کے زلہ خوار معلوم ہوتے ہیں'۔
> (نورالدین، ۲۱۴)

'سفرنامۂ روم ومصر وشام' کے تحت ابوسعید کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ 'پروفیسر آرنلڈ بھی ساتھ تھے، لیکن وہ مولانا کو راستہ میں ہی چھوڑ کر ولایت جانے کے لیے آگے بڑھ گئے'، (نورالدین، ۲۱۵) حالانکہ آرنلڈ اسی ارادے سے عازمِ سفر ہوئے تھے اور شبلی نعمانی اس سے باخبر تھے۔ اس سفرنامے کے بارے میں مؤلف کا یہ کہنا بھی بحث طلب ہے کہ 'یہ کتاب مولانا کا کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے'۔ (ایضاً)

'موازنۂ انیس ودبیر' پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شبلی نے میر انیس کو مرزا دبیر پر زبردستی ترجیح دی ہے، ابوسعید نے بجا لکھا ہے کہ 'موازنۂ انیس ودبیر' میں جو خوبیاں بیان ہوئی ہیں، ان کے مقابلے میں یہ اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھتا'۔ (نورالدین، ۲۱۹) ان کے خیال میں 'مولانا شبلی کی یہ کتاب اردو میں اپنی قسم کی پہلی اور بہترین ہے'۔ (ایضاً)

عطیہ فیضی کے حوالے سے انھوں نے لکھا:

> 'ان کو ہم نے ۱۹۶۰ء کے درمیان کے سالوں میں دیکھا ہے..... ان کی زندہ دِلی اور شوخیِ طبع اُن دِنوں میں بھی غضب کی تھی۔ ان کو دیکھ کر ہمیں مولانا شبلی اور علامہ اقبال یاد آتے تھے۔ ان کی وجہ سے مولانا شبلی کافی بدنام بھی ہوئے، علامہ اقبال کے بارے میں بھی بعض لوگوں کو بدگمانی رہی'۔ (نورالدین، ۲۲۵)

درج بالا بیان کے بین السطور طنز کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس کا تعلق کسی مؤرخ، محقق یا نقاد سے نہیں ہوسکتا۔

شبلی کی نثری خدمات کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے جن چند نکات سے ان کی انفرادیت نمایاں کی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ ان کی نثر شگفتہ، بلکہ دلفریب ہے، اس میں دلربائیاں پائی جاتی ہیں، ان کی عبارت میں عالمانہ شان ہونے کے باوجود دلکشی اور جاذبیت قائم رہتی ہے۔ ان کی تحریروں میں انقباض نہیں، بلکہ ہر جگہ انبساط ہے۔ پڑھنے سے دِماغ کو تسکین اور دل کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ (نورالدین، ۲۲۶)

۲۔ سرسید کی صحبت سے انھوں نے جدید دَور کے تقاضے کو محسوس کیا اور اس کے نئے رجحانات سے واقف ہوئے، لیکن انھوں نے مولانا حالی کی طرح اپنے آپ کو سرسید میں مدغم نہیں کیا اور اپنی شخصیت کو برابر ان سے الگ تھلگ ہی رکھا۔ (ایضاً)

۳۔ موضوع کے اعتبار سے مولانا شبلی اوّل درجے کے سوانح نگار ہیں، اس کے بعد وہ ایک مؤرخ بھی ہیں اور متکلم بھی، ایک نقاد بھی ہیں اور انشاپرداز بھی۔ (نورالدین، ۲۲۷)

۴۔ سوانح نگاری میں مولانا حالی کو اوّلیت حاصل ہے، لیکن مولانا شبلی نے اس صنفِ ادب کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ 'سیرت النبی'، 'سوانح مولانا روم' اور 'الفاروق' لکھ کر انھوں نے جو دادِ تحقیق دی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ (ایضاً)

۵۔ علم الکلام کا انداز بھی ان سے پہلے سرسید نے ڈال دیا تھا، لیکن مولانا شبلی نے اس میں وسعت نظر اور دِقت نظر سے کام لیا۔ ان کی خدمات سید کے مقابلے میں اس صیغۂ علم میں زیادہ ہیں۔ (ایضاً)

۶۔ تنقید میں مولانا نے 'موازنۂ انیس ودبیر' اور 'شعر العجم' لکھ کر جو خدمات انجام دیں، وہ بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔ (ایضاً)

درج بالا تنقیدی آرا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ شبلی کی ادبی خدمات کے بارے میں یہ آرا قابلِ توجہ ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'اردو نظم' باب ششم سے باب دہم، یعنی پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ شبلی نعمانی کا تذکرہ باب نہم 'اردو نظم میں اصلاحی اقدام' میں مولانا الطاف حسین حالی اور اسماعیل میرٹھی کے درمیان ملتا ہے۔ محض دو صفحات پر مشتمل اس تذکرے کا نصف حصہ کلامِ شبلی سے اقتباس سے مزین ہے اور باقی

عبارت تبصرے کی ذیل میں آتی ہے۔ ان کے ہاں سے تین اقتباس دیے جاتے ہیں، جن سے ان کے تنقیدی نتائج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ مولانا شبلی کو اسلام اور مسلمانوں سے عشق تھا۔ انھوں نے مذہبی اور قومی شاعری کو بڑی ترقی دی، بعض موقعوں پر پوری پوری مذہبی روایتیں نظم کر دی ہیں.....وہ قوم کی ان پرانی عظمتوں کے نوحہ خواں ہیں، جواَب امتدادِ زمانہ سے فسانہ بن چکی ہیں۔ وہ قوم کو اس غفلت سے بیدار کر کے پھر اس کی بھولی بسری کہانی یاد دِلانا چاہتے ہیں۔ (نورالدین، ۸۷۷)

۲۔ شاعری میں ان کی زیادہ سے زیادہ اہمیت اتنی ہے کہ انھوں نے بھی اس عہد کے دوسرے شاعروں کی طرح زمانے کے نئے رُخ کو پہچانا اور شاعری میں نیا طرز اختیار کیا۔ (نورالدین، ۸۷۸)

اوّل الذکر دونوں اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کی شاعرانہ عظمت نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن تیسرے اقتباس سے ان کی شاعری کے غالب سے لگا کھانے کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ غالبًا وہ یہاں محض رنگِ غالب کی بات کرتے ہیں، عظمت غالب سے اس جملے کو کوئی علاقہ نہیں۔ اس کے برعکس کلامِ شبلی کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری کا تعلق ایک طرف غالب سے ہے تو دوسری جانب اقبال سے۔ یہاں کلامِ شبلی سے دیے گئے چند اشعار سے مثال دی جاتی ہے:

وہ بھی تھا ایک دِن کہ یہ حسرت سرائے دِل
اِک محشرِ نشان وفورِ سرور تھا

رنگینی خیال سے لبریز تھا دِماغ
جو شعر تھا چراغِ شبستانِ حور تھا

(ایضاً)

ان اشعار کو مصنف نے رنگِ غالب سے سرشار پایا ہے، جب کہ نیچے دیے گئے اشعار سے اقبال کا رنگ جھلکتا ہے:

کون تھا، جس نے کیا فارس و یوناں تاراج
کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج

کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج

(نورالدین، ۸۷۷)

گویا ڈاکٹر ابوسعید نورالدین رنگِ شبلی کی خصوصیات کی نشاندہی میں ناکام رہے ہیں اور انھوں نے عمومی تبصرے سے کام چلایا ہے۔

اردو کی ادبی تاریخوں میں سب سے زیادہ ایڈیشن ڈاکٹر سلیم اختر کی ’اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ‘ کے منظر عام پر آئے۔ اس منصوبے کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہوا، ۱۹۷۰ء میں مسودہ مکمل ہو گیا اور ۱۹۷۱ء میں اس کا پہلا ایڈیشن منصۂ شہود پر آ گیا۔ اس وقت کتاب کا اکتیسواں ایڈیشن زیرِ نظر ہے، جو ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

جیسا کہ کتاب کے عنوان میں لفظ ’مختصر ترین‘ اس اختصار کی طرف توجہ دِلا رہا ہے، جو مصنف کے پیش نظر ہے، چنانچہ موضوعِ زیرِ بحث سے متعلق بھی کتاب کے محض دو صفحے مختص ہو سکے۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی اس تاریخ کا تعلق تحقیق سے زیادہ انشاپردازی سے ہے، چنانچہ اس کی تنقیدی، تجزیاتی یا تاثراتی آرا اپنے اسلوب کی بنا پر زیادہ متوجہ کرتی ہیں۔

۱۔ شبلی کئی معاملوں میں حالی کے برعکس تھے، شاید اسی لیے وہ تمام عمر سرسید کے نظریات کے دائرہ میں محبوس نہ رہ سکے۔ (سلیم، ۳۲۹)

۲۔ وہ اچھے نقاد بھی تھے، بلکہ تحسین شعر اور شاعری سے متعلق مسائل کی تفہیم میں حالی سے بڑھ جاتے ہیں، البتہ جذباتیت کے باعث تنقیدی آرا میں افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (ایضاً)

۳۔ پانچ جلدوں پر مشتمل ’شعرالعجم‘ فارسی شاعری کی تاریخ ہی نہیں، بلکہ چوتھی جلد میں شعر، شاعری، محاکات، تخیل، جذبہ اور شاعری اور ماحول کے تعلق پر ژرف نگاہی پر مبنی خیالات کا اظہار کیا، چنانچہ تخیل پر شبلی نے حالی سے کہیں بہتر بحث کی ہے۔ (سلیم، ۳۳۰)

۴۔ شبلی کی [سوانحی] تصانیف دیکھ کر قدم قدم پر ان کی محنت اور جستجو کا احساس ہوتا ہے، اسی لیے یہ کتابیں محض کسی عظیم شخصیت کے کوائف زیست کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس کے عہد اور معاشرت کی تصویر اور متذکرہ شعبۂ علم کی تاریخ بھی ہیں۔ (ایضاً)

ان کے بعض بیانات محض چونکا دینے کے لیے ہیں، مثلاً (۱) ’انگریزی سے واقف تھے، اس لیے سرسید کے کتب خانہ سے خوب استفادہ کیا‘، (ایضاً، ۳۲۹) حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ (۲) ’انھوں نے ۱۸۹۲ء میں پروفیسر آرنلڈ کی معیت میں مشرقِ وسطیٰ ترکی اور مصر کی سیر کی‘، (سلیم، ۳۳۰) درست بات یہ ہے کہ آرنلڈ کے یورپی سفر میں استنبول جانے کے لیے شبلی ان کے ساتھ ہو لیے۔ (۳) ’ابھی ’سیرۃ النبیؐ‘ کی دو جلدیں ہی چھپ سکیں کہ ان کا انتقال ہو گیا‘، (ایضاً) جب کہ معلوم ہے، سیرت کی ایک جلد بھی ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، بلکہ اس کی اشاعت کا مرحلہ ان کی رحلت کے بعد سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں طے ہوا۔

یقیناً دو صفحات میں اتنی بڑی شخصیت اور اتنے وسیع کام کا احاطہ ممکن نہیں، لیکن ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے خاص اسلوب میں ساری بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی، جس میں اگرچہ کامیابی ممکن نہ تھی، البتہ قاری کا شبلی نعمانی سے متعلق چند ایک بنیادی باتوں سے آگاہ ضرور ہو جاتا ہے۔

۱۹۸۳ء میں سید احتشام حسین کی مصنفہ ’اردو ادب کی تنقیدی تاریخ‘ شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شبلی نعمانی شخصیت اور فکر و فن پر تین صفحات وقف کیے گئے ہیں، جو شبلی جیسے عبقری کے لیے یقیناً ناکافی تھے، لیکن ۳۴۰ صفحات پر

اس تاریخ میں اس سے زیادہ کا مطالبہ مناسب بھی نہیں۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ تحقیقی نہیں، بلکہ تنقیدی تاریخ ہے؛ چنانچہ اس میں شبلی نعمانی سے متعلق بالعموم وہی باتیں دہرادی گئی ہیں، جو رام بابو سکسینہ نے لکھی تھیں اور جن کا تحقیقی جائزہ لیا جاچکا ہے۔ احتشام حسین کی چند آرا پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ '۱۸۸۲ء میں شبلی علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد ہو کر چلے گئے'، (احتشام، ۱۹۵) حالانکہ شبلی جنوری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں ملازم ہوئے اور وہ بھی اسسٹنٹ عربک پروفیسر۔

۲۔ 'آرنلڈ کے ساتھ وہ مصر و شام اور دوسرے اسلامی ممالک بھی گئے'۔ (احتشام، ۱۹۶) اس سلسلے میں اوپر بحث کی جاچکی ہے۔

البتہ ان کے بعض تنقیدی بیانات قابلِ لحاظ ہیں اور ان سے شبلی کے مقام و مرتبہ کا تعین کرنے میں مدد ملتی رہی ہے:

۱۔ شبلی کے تاریخی نقطۂ نظر اور مذہبی خیالات سے خود ان کے ہم مذہبوں نے اختلاف ظاہر کیا ہے، مگر ادبی تخلیق کے اعتبار سے ان کی بڑی اہمیت ہے۔ (احتشام، ۱۹۷)

۲۔ ان کے ادبی تجزیوں میں غلطیاں بھی ہیں، پھر بھی ان کی ادبی اہمیت سے رُوگرداں نہیں ہوا جاسکتا۔ (ایضاً)

۳۔ شبلی کی تنقید سائنسی تو نہیں ہوتی، مگر شعر و ادب سے محظوظ ہونے کے لیے بہت سے راستے دِکھاتی ہے۔ (ایضاً)

ڈاکٹر انور سدید کی 'اردو ادب کی تاریخ' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی، جب کہ اس کا دسواں ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، جن میں سے شبلی کا تذکرہ دسویں باب میں صفحہ ۲۸۵ سے ۲۸۷ تک ملتا ہے۔

تقریباً دو صفحات پر کسی شخصیت کے خد و خال کسی طور نمایاں نہیں ہو سکتے اور وہ شخصیت اگر شبلی جیسی نابغۂ روزگار ہستی ہو تو مزید دُشواری پیش آتی ہے، تاہم اس تاریخ میں چند پیراگراف کے اندر شبلی کی شخصیت کا پورا خاکہ اور اردو ادب میں ان کی خدمات کو جس جامعیت سے پیش کیا گیا ہے، وہ بھی ایک نادر بات ہے۔ ان کے درج ذیل چند جملوں سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

۱۔ شبلی نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی جنگ پہلے سر سید کے رفیق کی حیثیت میں اور پھر ذاتی حیثیت میں لڑی اور معاشرت، سیاست، مذہب اور ادب پر مستقل اثرات ثبت کیے۔ (انور، ۲۸۶)

۲۔ حالی کی خاندانی مفلوک الحالی نے انکسار اور نذیر احمد کی ٹکر گدائی نے انحصار کے زاویے پیدا کیے تھے، لیکن شبلی کے راجپوتی خون نے حریت پسندی کا راستہ قبول کیا اور اظہارِ فکر و نظر کے لیے وہ نئے نئے میدانِ حرب و عمل تلاش کرتے رہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ کو عہدِ حاضر میں کتابوں میں مجسم کرنے کی سعی کی۔ (ایضاً)

۳۔ شبلی کے داخل میں جو جمال پسند تخلیق کار موجود تھا، اُس کی جھلک 'دستۂ گُل'، 'بوئے گُل' اور 'برگِ گُل' کی فارسی تخلیقات میں اور قومی زاویہ دوسری نظموں میں سامنے آتا ہے اور ان سے شبلی کی جذباتی زندگی کے جزر و مد کا گراف بنانا بھی ممکن ہے۔ ان کی شخصیت کے بعض دلآویز خطوط ان کے مکتوبات، رسالہ 'الندوہ' اور 'سفرنامۂ روم و مصر و شام' سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ (انور، ۲۸۷)

۴۔ شبلی ادیب اور شاعر ہی نہیں، عالم اور مفکر بھی تھے۔ انھوں نے مفکر کی حیثیت میں جو کچھ سوچا، اسے ادیب کی حیثیت میں پیش کیا۔ (ایضاً)

۵۔ اسلاف کی سوانح سے عہدِ حاضر کے مسلمانوں کو حوصلہ اور قوت عطا کی اور سر سید سے علیٰحدہ ہوئے تو ان کی علمی جہت کو برقرار رکھتے ہوئے پہلے ندوۃ العلما اور پھر دار المصنّفین قائم کیا۔ (ایضاً)

انور سدید نے شبلی کی خطوط نگاری کو ان کے رومانی اسلوب کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ خطوط ان کی جذباتی وارفتگی کو بھی پوری طرح منعکس کرتے ہیں۔ انور سدید، غالب کے بعد شبلی کو اردو کا بلند مرتبہ مراسلہ نگار سمجھتے ہیں۔ ان خطوں کے حوالے سے مصنف نے بعض نئی باتیں لکھی ہیں:

> شبلی کے خطوط، ہر چند مقصد کی ڈور میں لپٹے ہوئے ہیں، لیکن ان کے ہاں مقصد کی تکمیل جذباتی آسودگی ہی کا عنوان ہے۔ یہ خطوط ایک ایسے جمال پرست انسان کے ہیں، جو مایوسی سے ہم کنار نہیں ہوتا اور بیداری کے خوابوں کو بیان کرنے کا حوصلہ رکھنے کے علاوہ ان کی تعبیر دیکھنے کا بھی آرزومند ہے۔ وہ اپنے خطوط میں مجسم مسرت و انبساط نظر آتے ہیں اور اچھی کتاب، اچھا لطیفہ اور خوب صورت جملہ ان کی رَگوں میں خون کی گردش تیز کر دیتا ہے۔ عطیہ کے نام ان کے خطوط اسی مزاج کے عکاس ہیں۔ (انور، ۳۰۷)

البتہ انھوں نے اس خیال کی تردید کی ہے کہ 'شبلی عورتوں کو خطوط لکھنے والے پہلے ادیب تھے'۔ ان کی تحقیق کے مطابق، 'ان سے قبل واجد علی شاہ اس صنف میں اپنا سکہ قائم کر چکے تھے'۔ (ایضاً)

صفحہ ۳۰۹ پر مصنف نے 'سفرنامہ' کے ذیل میں 'سفرنامۂ روم و مصر و شام' کو شبلی کی علمی جستجو کا مظہر اور ان کی داخلی جستجو کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ انور سدید کا کہنا بجا ہے کہ کتاب کی جذباتی دردمندی پر اس کا علمی مرتبہ غالب آ گیا ہے۔

اس نہایت مختصر تحریر میں انور سدید نے مطالعۂ شبلی میں جو نتائج برآمد کیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اس موضوع پر مفصل لکھتے تو تنقیدِ شبلی میں کئی نئے در وا ہو سکتے ہیں۔

تبسم کاشمیری کی رجحان ساز 'اردو ادب کی تاریخ'، جسے بجا طور پر اردو زبان و ادب کی تواریخ کا سرمایہ قرار دیا جاسکتا ہے، ۲۰۰۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور کی طرف سے منصۂ شہود پر آئی۔ اس تاریخ کی حدود ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک ہیں اور ظاہر ہے کہ شبلی کی ادبی خدمات کا تعلق بعد کے دَور سے ہے، تاہم مصنف نے شبلی نعمانی کی تصانیف 'شعرالعجم' اور 'موازنۂ انیس و دبیر' کی بعض تنقیدی آرا سے استفادہ کیا ہے، اس وقت انھی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔

کتاب کے باب نہم 'شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کا آغاز اور محرکات' میں

ایہام گوئی کی تحریک کے تحت دلّی کی ادبی فضا پر صائب اور بیدل کے اثرات کا جائزہ لیا گیا۔ اس مقام پر ڈاکٹر تبسم نے لفظوں کے در و بست اور نشست و برخاست کے حوالے سے اُس وقت کے فارسی شعرا کے بارے میں شبلی کے اس بیان کو پیش کیا، یعنی ’قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے۔ متاخرین کا یہ خاص انداز ہے کہ جو بات کہتے، پیچ دے کر کہتے‘۔ (تبسم، ۲۶۳) اسی طرح درد کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم شبلی کے اس بیان سے اپنی بات پر زور دیتے ہیں کہ ’وحدت الوجود بادۂ تصوف کا نشہ ہے‘۔ (تبسم، ۳۵۰)

انیس و دبیر پر گفتگو کرتے ہوئے شبلی کو نظرانداز کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے اب تک اس پر شدید ردّ عمل منظر عام پر آ چکا ہے، اس کے باوجود اس کتاب کی اہمیت کم نہیں ہوئی؛ چنانچہ ڈاکٹر تبسم کے ہاں بھی اس کتاب سے استفادے کی کئی ایک مثالیں سامنے آتی ہیں۔

ڈاکٹر تبسم نے کتاب کے باب انیس ’مرثیہ: لکھنؤ کی مذہبی ثقافت کا ایک مظہر‘ میں انیس و دبیر کا موازنہ کرتے ہوئے دبیر پر شبلی کے اعتراضات کا ذکر کیا اور ان کا خلاصہ پیش کر کے سید عابد علی عابد کے مقدمہ موازنہ سے ان کا جواب دیا اور دلیل میں ایک طویل اقتباس درج کیا؛ لیکن وہ خود عابد علی عابد سے متفق نہ ہو سکے اور اپنے تاریخی شعور اور مؤرخانہ نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے شبلی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لکھتے ہیں:

> کسی شاعر کی فنی عظمت کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سرمایے کے ساتھ کس حد تک نئے ادوار میں داخل ہو کے آگے جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے اگر دبیر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اس کے قدم ادبی تاریخ کے سفر میں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ (تبسم، ۱۸۵)

شبلی نعمانی کے تنقیدی خیالات سے استفادہ اور دبیر سے متعلق ان کے خیالات کی خاموش تائید سے ڈاکٹر تبسم کے ہاں شبلی کے تنقیدی افکار کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اردو زبان و ادب کی ایک اہم تاریخ، جسے ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک شاندار علمی کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے، ’تاریخِ ادبِ اردو‘ ہے، جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ مجلس ترقی ادب لاہور کی جانب سے اس تاریخ کی جلد اوّل ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی، دوسری ۱۹۸۲ء میں، تیسری جون ۲۰۰۶ء میں اور تیسری جلد ۲۰۱۲ء میں منصۂ شہود پر آئی۔

جلد اوّل میں شبلی کی ’شعر العجم‘ کا ایک حوالہ ہے، جلد دوم میں ’شعر العجم‘ اور ’مقالاتِ شبلی‘ سے ایک ایک، جلد سوم میں ’موازنۂ انیس و دبیر‘ سے دو اور جلد چہارم میں ’موازنہ انیس و دبیر‘ کا حوالہ ’میر ببر علی انیس‘ میں نو مرتبہ اور ’مرزا سلامت علی دبیر‘ میں تین دفعہ دیا گیا ہے۔

اب تک علامہ شبلی نعمانی پر سب سے جامع مقالہ زیرِ نظر تاریخ کی چوتھی جلد میں ملتا ہے، جو کتاب کے صفحہ ۱۰۵۹ سے ۱۱۰۷ کو محیط ہے اور ۱۱۳/حوالوں سے مزین ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس باب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے؛ یعنی ’تمہید، حالاتِ زندگی، عطیہ فیضی، شخصیت و مزاج‘، ’شبلی کی تصانیف‘ (علم الکلام اور شبلی، شبلی اور تاریخ نویسی، ادب اور تنقید، شبلی کی نثر نگاری اور طرزِ ادا) اور ’شبلی کی شاعری‘۔

مقالے کے پہلے ذیلی عنوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ابھی تک امین زبیری اور وحید قریشی کے زیرِ اثر ہیں، ورنہ مقالے کی ابتدا میں عطیہ فیضی کا نام ٹانکنا کچھ ایسا ضروری نہیں تھا کہ جس کے بغیر شبلی نعمانی کی شخصیت مکمل نہ ہوتی۔ اگر شبلی کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے عطیہ واقعی اہم ہیں تو سر سید، علی گڑھ، ندوۃ العلما اور دار المصنّفین کا تذکرہ بھی اسی جگہ ہونا چاہیے تھا، کیونکہ شبلی کی شخصیت پر ان سب کے عطیہ سے زیادہ اثرات ہیں۔

ابتدائی حصے میں بالعموم ’حیاتِ شبلی‘، ’مکاتیبِ شبلی‘، ’سفرنامہ روم و مصر و شام‘، ’خطوطِ شبلی‘ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ حصہ بہت مفصل ہے اور اس سے شبلی کی سوانح، شخصیت اور ذہنی و فکری ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، لیکن اس میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ کم ہی رکھا گیا ہے؛ بالخصوص عطیہ فیضی سے تعلق اور گزندِ پا کا واقعہ زمانی اعتبار سے اپنے اپنے مقام پر نہیں۔ شبلی کی شخصیت سازی پر لکھتے ہوئے بھی مختلف خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے اور اس میں حسن ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا۔

اوّل اوّل جملہ تصانیف کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے، جس کے بعد ان تصانیف کا مختلف شعبوں کے اعتبار سے الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔ ’علم الکلام اور شبلی‘ بجائے خود ایک اعلیٰ تنقیدی مضمون کا درجہ رکھتا ہے۔ بلاشبہ یہ مضمون اپنے موضوع پر ایک ایسی تحریر ہے، جس پر اضافہ بہت مشکل ہے۔ اس حصے میں شبلی کی تمام کلامی کتب (’علم الکلام‘، ’الکلام‘، ’الغزالی‘ اور ’سوانح مولانا روم‘) کا بہت اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ’علم الکلام‘، ’الکلام‘ کے حوالے سے رائے قائم کرتے ہوئے مصنف نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ موجد کی حیثیت سے مولانا نے غلطیاں بھی کی ہیں، مگر اس سے ان کی جدت اور اوّلیت کی اہمیت کم نہیں ہوتی.... یہ بات مسلّم ہے کہ ’علم الکلام‘ اور ’الکلام‘ اردو میں اپنی قسم کی پہلی تصانیف ہیں اور انھیں مذہب کو جدید روشنی میں قائم رکھنے کی اہم ترین کوششوں میں شمار کرنا چاہیے۔ (جمیل، ۱۰۷۹)

جالبی ’الغزالی‘ اور ’سوانح مولانا روم‘ کو ’علم الکلام‘ کی کتابیں قرار دیتے ہیں اور ان کی سوانحی حیثیت سے مطمئن نہیں ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

> ان کے نزدیک، امام غزالی جدید علمِ کلام کے موجد ہیں اور اس لیے اس کتاب میں وہ اپنی توجہ علمِ کلام پر مرکوز رکھتے ہیں.... اگر ’الغزالی‘ کو سوانح کے معیار سے دیکھا جائے تو اس میں مسلمانوں کے سب سے اہم فلسفی امام غزالی کے علم اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ نہیں لیا گیا، اس لیے جدید سوانح نگاری کے معیار پر یہ پوری نہیں اُترتی۔ (جمیل، ۱۰۸۰)

جمیل جالبی کو شبلی کی تاریخ نویسی پر بھی کئی ایک اعتراضات ہیں۔ ان کے خیال میں ’تاریخ نویسی میں بھی مذہب و ملت سے ان کی گہری دلچسپی نمایاں رہتی ہے اور ان کی تاریخ بھی علمِ کلام کے دائرے میں رہتی ہے‘ (ایضاً) اور یہ کہ ’ان کی تاریخی تصانیف میں مخالف رایوں پر بحثیں ملتی ہیں اور اکثر ’تاریخ‘ غیر جانب دارانہ رویہ پیش کرنے کے بجائے دفاعی استدلال پیش کرتی ہے‘۔ (ایضاً) دوسری جانب یورپی تاریخی کتب کے مطالعات کی وجہ سے شبلی سے جو توقعات رکھتے ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں؛ چنانچہ تقریباً سات صفحات پر محض یہی سمجھا سکے کہ ’ان کی تاریخی تصانیف پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ عقیدہ کی بِنا پر جو بات ان کے دل میں بیٹھ گئی ہے، وہ اس کے خلاف بات پر استدلال کرنے میں لگے ہوئے ہیں‘۔ (جمیل، ۱۰۸۶)

جمیل جالبی نے شبلی کی تاریخی تصانیف کو دو حصوں میں منقسم قرار دیا ہے، یعنی ایک حصے میں واقعات یا حالاتِ زندگی اور دوسرے میں اخلاق و عادات اور کارناموں کی تفصیل۔ وہ پہلے حصے کو قدما کے انداز سے قریب سمجھتے ہیں، جب کہ دوسرے حصے کو جدید طرز سے؛ البتہ ’الفاروق‘ کو ’تاریخ نگاری کا شاہکار‘ تسلیم کرتے ہیں۔ (جمیل، ۱۰۸۸)

یہ حصہ شبلی کی تاریخ نویسی پر تنقید سے زیادہ اعتراضات سے بھرا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے، جالبی کسی طور شبلی کی تاریخ نویسی کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں، چنانچہ ہر پیراگراف میں وہ کوشاں ہیں کہ کسی طرح شبلی کی مؤرخانہ حیثیت کو کم سے کم کیا جا سکے۔

اس مقالے کا ایک اَور جاندار حصہ ’ادب اور تنقید‘ ہے، جس میں ’موازنۂ انیس و دبیر‘، ’شعرالعجم‘، مقالات اور مکاتیب میں شبلی کی تنقیدی آرا کی روشنی میں شبلی کی انتقادی صلاحیتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کہنا بجا ہے کہ ’حالی انگریزی معیارِ ادب کو اپنا کر اس میں مشرقی طرزِ تنقید کو ملاتے ہیں، ان کے برخلاف شبلی مشرقی معیارِ تنقید کو بنیاد بنا کر اس میں مغربی فکر کا امتزاج کرتے ہیں‘۔ (جمیل، ۱۰۸۹)

جمیل جالبی بھی انیس کی طرف داری کے حوالے سے معترض ہیں، تاہم ان کا یہ کہنا درست ہے کہ ’شبلی انیس کی طرف داری کی وجہ سے موازنہ میں تو کامیاب نہیں ہیں، لیکن خود انیس کا مطالعہ عملی تنقید کا بہترین نمونہ ہے‘ (جمیل، ۱۰۹۲) اور یہ کہ ’آج شبلی کی یہ تصنیف میر انیس و مرزا دبیر کے موازنہ کے طور پر اہمیت نہیں رکھتی، لیکن اس کی اصلی اہمیت یہ ہے کہ اس میں جس طرح کلامِ انیس کا تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے، وہ نیا اور اچھوتا ہے‘۔ (ایضاً)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ’شعرالعجم‘ کے جملہ مندرجات پر جامع گفتگو کی ہے۔ ان کا یہ کہنا اہمیت رکھتا ہے کہ ’’شعرالعجم‘ میں سنہ، تاریخ، حالات و واقعات کی صحت سے زیادہ شاعروں اور اصنافِ سخن کے تنقیدی جائزہ پر زور دیا گیا ہے۔ یہی تنقیدی مطالعے ’شعرالعجم‘ کی جان ہیں‘ (جمیل، ۱۰۹۳) اور یہ کہ ’شعرالعجم‘ میں مختلف زاویوں سے اضافے کیے جا سکتے ہیں، مگر فارسی شاعری کا ذوق پیدا کرنے اور فارسی شاعری کی روایت کے اصول جاننے کے لیے شبلی سے بہتر رہبر مشکل سے ملے گا‘۔ (جمیل، ۱۰۹۵)

پہلی اور دوسری خصوصیت کو جالبی کا تکیہ کلام قرار دینے کے باوجود، درج بالا آرا کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا؛ چنانچہ شبلی کی تنقیدی حیثیت کے بارے میں ان کا یہ کہنا حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے:

> ’شبلی کے ہاں اصولِ تنقید تفصیل کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور عملی تنقید میں بھی مذاقِ سخن اس طرح نمایاں ہوتا ہے کہ شعر و ادب کا ایسا ستھرا ذوق کہیں اَور مشکل سے دِکھائی دیتا ہے.... ان کی ادبی تنقید میں فکری عناصر بھی نمایاں ہیں اور کلامی مزاج کے باوجود تنگ دِلی اور شدت کا پتہ نہیں چلتا۔ (جمیل، ۱۰۹۰)

شبلی کی متنوع موضوعات سے متعلق تحریروں میں ان کی انفرادیت تلاش کی جائے تو وہ ان کا اسلوبِ نگارش ہے، چنانچہ ڈاکٹر جالبی نے ان کی نثر نگاری اور طرزِ ادا کی خصوصیات کو پانچ اجزا کا مرکب قرار دیا ہے، یعنی قدیم طرزِ انشا، جدید سادگی و صفائی، استدلالی رنگ، شاعرانہ انداز اور فن کاری۔

مقالے کا آخری جز ’شبلی کی شاعری‘ مجموعی طور پر مقالے کا کمزور ترین حصہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس میں شبلی کی اردو اور فارسی شاعری پر مفصل گفتگو نہیں کی جا سکی؛ البتہ شبلی نے مقالے کے پہلے ذیلی عنوان میں عطیہ کے نام کو شامل کیا تو آخر صفحے پر عطیہ کو فراموش نہ کر سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی عطیہ کے بغیر علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کو سمجھنے پر تیار نہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ مقالہ اپنے اندر بہت سی خوبیوں کے باوجود شبلی کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے بارے میں بعض تعصّبات سے عبارت ہے۔ مقالے کے مختلف حصوں میں توازن قائم نہیں رکھا جا سکا اور بعض آرا جا بجا دخل اندازی کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ دَورانِ مطالعہ احساس ہوتا ہے کہ مقالہ نگار شبلی کے مذہبی لگاؤ، ان کے کلامی مزاج اور عطیہ فیضی سے تعلق کی تکون سے باہر نہیں نکل سکا۔ شبلی پر ہونے والے اب تک کے تحقیقی، تنقیدی اور فکری کام کے بعد زیرِ نظر تاریخ میں ایک بہتر مقالے کی توقع کی جا سکتی تھی، جو بوجوہ پوری نہ ہو سکی۔

اردو زبان و ادب کی تواریخ میں سے رام بابو سکسینہ، حامد حسن قادری، ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، ڈاکٹر سلیم اختر، سید احتشام حسین، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر جمیل جالبی کے ہاں کسی نہ کسی درجے پر شبلی کی شخصیت اور فکر و فن پر تنقیدی جائزہ ملتا ہے۔ شبلی پر رام بابو سکسینہ کے ہاں ابتدائی تنقیدی جملے خاصے اہم ہیں، بعد ازاں ڈاکٹر سلیم اختر، سید احتشام حسین اور ڈاکٹر انور سدید کے ہاں بھی مختصر گفتگو ملتی ہے؛ البتہ مولانا حامد حسن قادری اور جمیل جالبی کے ہاں علامہ کی شخصیت اور علمی و ادبی فتوحات پر مفصل اور جامع تحقیقی و تنقیدی تبصرے ملتے ہیں۔ ان میں صرف حامد حسن قادری کے ہاں ایک متوازن رویہ ملتا ہے اور انھوں نے علامہ شبلی نعمانی پر لکھتے ہوئے غیر جانب دارانہ، غیر متعصّبانہ اور معروضی نقطۂ نظر اپنایا ہے۔ ○○